© rasailojaraid.com

تلک عشرۃ کاملۃ

نیاز فتحپوری کے دس سوالوں کے جوابات

(سعید احمد)

نگار لکھنؤ میری نظر سے نہیں گذرتا۔ ۱۹ ستمبر کو میں مسوری سے واپس آیا تو دفتر برہان میں مجھ کو اگست کا نگار ملا، اور اس کے ساتھ ہی گورنمنٹ آف انڈیا سے متعلق بعض نوجوان دوستوں کا ایک خط بھی ملا۔ جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ نیاز صاحب نے نگار میں علماء کرام سے جو دس سوال کیئے ہیں، مہربانی فرما کر نیاز صاحب کی خاطر نہیں تو کم از کم ہم لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے ہی ان کے جوابات لکھ دیجیئے۔ یہ واقعہ ہے کہ میں نیاز صاحب کو کسی سنجیدہ علمی بحث کا اہل نہیں سمجھتا، لیکن اب محض اپنے نوجوان دوستوں اور بعض ناواقف مسلمانوں کی خاطر یہ جوابات لکھ رہا ہوں۔ نیاز صاحب کی یہ خصوصیت ہے کہ فنون سے بے خبر ہونے کے باوجود ہر فن کی اصطلاحات بہت بے محل استعمال کر بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ ان سوالات میں بھی انہوں نے اپنے آپ کو فلسفی ظاہر کرنا چاہا ہے۔ اس بنا پر لامحالہ جوابات بھی اسی طریقہ پر دیئے گئے ہیں۔ جوابات میں نے قصداً مختصر لکھے ہیں۔ کیونکہ مقصد محض جواب ہے۔ کوئی علمی بحث و گفتگو نہیں۔ بہتر ہوگا کہ قارئین کرام جوابات پڑھنے سے پہلے نگار بابت اگست ۱۹۴۰ء اپنے سامنے رکھیں اور ہر سوال کا الگ الگ جواب پڑھتے چلے جائیں۔

(۱) قرآن مجید (بحیثیت کلام خداوندی ہونے کے) خدا کے ساتھ از خود وجود میں آیا ہے۔ نیاز صاحب اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے قرآن مجید کا خدا کی طرح قدیم ہونا لازم آتا ہے۔ حالانکہ قدیم سوائے خدا کے کوئی دوسری چیز نہیں ہے لیکن ان کا اعتراض سراسر لغو اور باطل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیاز صاحب فلسفہ کے ابتدائی طالب علم کی طرح یہ بھی جانتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ قدیم اور واجب الوجود میں کیا فرق ہے؟ تمام علماء کے نزدیک یہ مسلم ہے کہ تعدد وجباء محال ہے، یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ واجب الوجود ایک سے زیادہ ہوں۔ کیونکہ واجب الوجود کی ماہیت عین وجود ہے۔ اس لیے یہ کلی ایسی ہے جو منحصر فی فرد واحد ہے۔ اس کے لیے تعدد ہو ہی نہیں سکتا۔ باقی رہا قدیم تو اس کے لیے کسی کے نزدیک بھی تعدد محال نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ارباب منطق وفلسفہ عقل اول کو ذات واجب الوجود کی طرح قدیم مانتے ہیں اور معلول اول ہونے کی وجہ سے واجب الوجود اور عقل اول میں صرف تقدم وتاخر ذاتی کے قائل ہیں تقدم وتاخر زمانی کے نہیں۔ اور آپ دور کیوں جاتے ہیں۔ عالم کو ہی دیکھ لیجیے۔ معتزلہ کا ایک بڑا فرقہ اور حکمائے اسلام میں فارابی، ابن سینا اور ابن رشد خدا کو واجب الوجود اور قدیم ماننے کے ساتھ ساتھ عالم کو بھی قدیم تسلیم کرتے ہیں۔ افسوس ہے نیاز صاحب منطق وفلسفہ کی ابجد سے بھی واقف نہیں، ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ ہر ممکن الوجود کے لیے حادث ہونا ضروری نہیں بلکہ وہ قدیم بھی ہو سکتا ہے۔

(۲) جی ہاں! قرآن شریف نام ہے ان الفاظ یا حروف کا جو کاغذ پر منقوش ہوتے ہیں جو پریس کے ذریعہ سے چھاپے جاتے ہیں۔ اور جو انسان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ اس پر نیاز صاحب کا اعتراض یہ ہے "تو کلام مجید کا ہر نسخہ کلام خداوندی ہے اور جو نسخہ ان میں سے ضائع ہو جائے اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ خدا کا کلام ضائع ہو گیا۔" سخت افسوس ہے کہ نیاز صاحب نے یہ اعتراض کر کے بھی اپنی انتہائی لاعلمی کا ثبوت دیا ہے، انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کسی شے کی صفت عرضی کے عدم سے خود اس شے کی ذات اور ماہیت کا عدم لازم نہیں آتا، مثلاً ہنسنا، رونا، بات کرنا، کھانا اور پینا، یہ سب انسان کی صفات عرضیہ ہیں۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ان سب کے معدوم ہو جانے سے موصوف یعنی انسان کا معدوم ہو جانا لازم نہیں آتا۔ پس اسی طرح قرآن مجید کے الفاظ وحروف کا پریس سے چھپنا اور انسان کی زبان وحلق سے ادا ہونا یا ان الفاظ کا ایک خاص کمیت ومقدار کے کاغذ پر مرتسم ہونا۔ یہ سب قرآنی الفاظ کی صفات عرضیہ ہیں۔ اس بنا پر اگر قرآن مجید کا ایک نہیں بلکہ سب نسخے بھی ضائع ہو جائیں تب بھی اس سے قرآن مجید کا ضائع ہو جانا لازم نہیں آتا۔ وہ اگر کاغذ پر جلوہ نما نہیں ہوگا تو لاکھوں انسانوں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سینوں میں محفوظ ہوگا۔ اور اگر خدانخواستہ کسی سینہ میں بھی نہ ہوگا تو عالم حقیقت میں ضرور ہوگا۔ موجودہ دور ترقی میں جبکہ سائنس داں زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کے متعلق یہ دعویٰ کررہے ہیں کہ یہ الفاظ زبان سے نکلنے کے بعد فنا نہیں ہوتے بلکہ وہ فضا میں موجود رہتے ہیں، یہ سمجھنا بہت آسان ہوگیا ہے کہ قرآن مجید کے تمام نسخے اگر ضائع ہوجائیں تب بھی نفس قرآن مجید فنا نہیں ہوسکتا۔ بلکہ وہ باقی رہے گا۔

(۳) قرآن پاک خدا کا کلام ہے اور نیاز صاحب نے جو دو صورتیں بتائی ہیں ان میں سے وہ ایک صورت کے ساتھ قائم ہے یعنی وہ خدا کا عین ذات نہیں، بلکہ صفت ربانی ہے۔ اب نیاز صاحب اس پر اعتراض یہ کرتے ہیں کہ "چونکہ خدا کی ہر صفت اس کی ذات سے جدا نہیں ہے۔ اس لیے یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ الفاظ یعنی عربی زبان بھی خدا کی طرح قدیم ہے۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ نیاز صاحب ازراہ کرم خدا کی دوسری صفات مثلاً علم، قدرت، خلق وغیرہ کی نسبت بتائیں کہ وہ انہیں قدیم مانتے ہیں یا نہیں جیسا کہ خود ان کے بیان سے ثابت ہوتا ہے۔ وہ یقیناً انہیں قدیم مانتے ہیں کیونکہ واجب الوجود محل حوادث نہیں ہوسکتا۔ اب نیاز صاحب اس پر غور کریں کہ علم، خلق، قدرت یہ سب صفات قدیم ہیں۔ مگر ان کا تعلق حوادث کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ تعلق بھی خدا ہی کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں "خدا نے زید کو پیدا کیا۔ خدا نے اپنی قدرت سے مسلمانوں کو غزوۂ بدر میں فتح دی" اسی طرح جو چیزیں آج کل کی ذہنی و دماغی ترقیات کی پیداوار ہیں مثلاً ہوائی جہاز، موٹر، ریل، تار برقی، آبدوز کشتیاں وغیرہ ہم ان سب چیزوں کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ سب چیزیں خدا کے علم میں ہیں۔ تو اب بتائیے کہ کیا ان سب چیزوں کے حادث ہونے سے خدا کی صفت علم، خلق اور قدرت کا حادث ہونا، یا خدا کی ان صفات کے قدیم ہونے کے باعث ان تمام حادث چیزوں کا قدیم ہونا لازم آتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ تمام "مخلوق" "معلوم" اور "مقدور" چیزیں حادث ہی رہیں گی۔ اور اللہ کی صفت خلق، علم اور قدرت قدیم اور اس کے باوجود ان سب کی نسبت اللہ کی ہی طرف ہوگی کیونکہ ان تمام چیزوں کے وجود و حدوث کا سرچشمہ خدا کی یہ صفات ہی ہیں۔ پس اسی پر قرآن مجید کے عربی الفاظ و حروف کو قیاس کرلیجئے کوئی شبہ نہیں کہ عربی زبان قدیم نہیں حادث ہے لیکن اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے باوجود چونکہ قرآنی الفاظ و حروف کا مبداءِ وجود اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کا تعلق ہے اس بنا پر ان الفاظ و حروف کو بھی کلام ربانی کہا جائے گا۔ اور اب کلام ربانی کہنے میں نہ عربی زبان کا حدوث مخل ہو سکتا ہے اور نہ ان واقعات حادثہ کا ذکر مانع ہو سکتا ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ تمثیلاً یہ عرض کرنا بے محل نہیں ہوگا کہ آپ دیکھتے ہیں بجلی کا خزانہ (POWER HOUSE) ایک جگہ موجود ہوتا ہے اور جہاں جہاں بجلی کے تار اور قمقمے (BULBS) لگادیے جاتے ہیں وہاں بجلی پہنچ جاتی ہے۔ تو کیا کوئی شخص کسی خاص کمرہ میں ایک مخصوص قمقمہ میں بجلی کی روشنی دیکھ کر یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس کا تعلق بجلی کے خزانہ سے نہیں ہے؟ یا آفتاب کی شعاعیں مختلف مکانوں کے مختلف الاشکال روشندانوں میں سے چھن چھن کر مکان میں آتی ہیں تو کیا کوئی عقلمند یہ سمجھتا ہے کہ ان مختلف الشکل شعاعوں کا منبع آفتاب نہیں ہے؟ پس اسی طرح اگر اللہ کی صفت کلام کا ظہور عربی کے مخصوص الفاظ و حروف میں ہو رہا ہے تو کیا محض عربی زبان کے حادث ہونے کی وجہ سے ہم قرآن مجید کے کلام خداوندی ہونے سے انکار کر سکتے ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔

(۴) چوتھے سوال میں نیاز صاحب نے قرآن مجید کو "نطق خداوندی" قرار دے کر سخت ترین مغالطہ دینا چاہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن مجید کو کلام خداوندی تو سب مسلمان مانتے ہیں لیکن اسے "نطق خداوندی" کوئی بھی نہیں کہتا۔ خود قرآن نے اللہ تعالیٰ کے لیے صفت کلام ثابت کی ہے۔ صفت نطق نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے "وکلم اللہ موسیٰ تکلیماً" اور اللہ نے حضرت موسیٰ سے خوب کلام کیا۔ اس پر نیاز صاحب اعتراض کرتے ہیں کہ کلام بغیر نطق کے ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن ہمیں سخت حیرت ہے کہ کس طرح کوئی فہمیدہ انسان ایسی بات کہہ سکتا ہے۔ ایک شاعر اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتا اور پوری غزل کاغذ پر لکھ کر لوگوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ یہ غزل اسی شاعر کا کلام ہے یا نہیں؟ کوئی شبہ نہیں کہ کلام ہے مگر اس کے باوجود "نطق" بالکل نہیں پایا جارہا ہے۔ اور اسے تو سب جانتے ہیں کہ بعض اوقات زبان حال سے دل کا مطلب ایسے بلیغ پیرایہ میں ادا ہو جاتا ہے کہ زبان قال سے بھی ادا نہیں ہوتا۔ اور اسی بنا پر کسی نے سچ کہا ہے۔ "در خموشی معنیست کہ در گفتن نمی آید"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عربی کا ایک شاعر کہتا ہے:

وللقلب على القلب دليل حين يلقاه

وفي الناس من الناس مقاييس واشباه

وفي العين غنى للمرء ان تنطق افواه

ایک اور شاعر نے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں کہا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس نے زبان چشم کی گویائی کو وحی سے تعبیر کیا ہے۔

تری عینها عینی فتعرف وحیها وتعرف عینی مابه الوحی یرجعُ

ایک شاعر آنکھ کے ذریعہ کسی مافی الضمیر کو اپنے مخاطب پر ظاہر کر دینے کو آنکھ کا "نطق" بتاتا ہے۔ سنیے۔

العين تبدى الذى فى نفس صاحبها من المحبة او بغض اذا كانا

والعين تنطق والا فواه صامتة حتى ترى من ضمير القلب تبياناً

اسی سلسلہ میں ایک اور شعر پیش خدمت ہے۔ جس میں شاعر کہتا ہے کہ مشکل اور پیچیدہ بات بھی آنکھ سے ظاہر کی جاسکتی اور آنکھ سے ہی سمجھ لی جاسکتی ہے۔

وعين الفتى تبدى الذى في ضميره وتعرف بالنجوى الحديث المغمّسا

ممکن ہے نیاز صاحب اور ان کے ہم خیال اعتراض کریں کہ ان اشعار سے تو صرف حدیث عشق و محبت یا جذبہ نفرت و عداوت کا آنکھ کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے۔ پوری گفتگو بغیر نطق کے س طرح ہو سکتی ہے؟ تو انہیں سمجھنا چاہئے کہ جو کچھ عرض کیا گیا محض برائے تمثیل ہے۔ اس سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ جب دو دل علاقہ محبت کے باعث پائے گفتگو کو درمیان میں لائے بغیر ایک دوسرے کا مطلب سمجھ سکتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس مطلب کا اظہار ہوگا تو الفاظ کے ذریعہ ہی ہوگا۔ اور ان الفاظ کا انتساب بھی "متکلم" کی طرف ایسا ہی ہوگا جیسا کہ ان کے مفہوم و مراد کا۔ تو پھر اس میں کونسا عقلی استبعاد ہے کہ ذات احدیت اور حقیقت محمدیہ میں قرب قاب قوسین اور اتصال معنوی ہونے کی بنا پر وقتاً فوقتاً مکالمہ ہو اور وہ اہل عالم کے لیے قرآن مجید کی شکل میں ظاہر ہو۔ خود قرآن مجید نے مکالمہ الٰہی کی صورت اس طرح بیان کی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وماکان لبشر أن یکلمه الله الا کسی انسان کی یہ مجال نہیں کہ خدا اس سے کلام

وحیاً اومن وراء حجاب کرے لیکن وحی کے ذریعہ یا پردہ کی آڑ سے

جس طرح چشم حبیب کی گویائی سے صرف محب ہی مطلب و مراد سمجھ سکتا ہے اسی طرح ذات احدیت سے شرف ہمکلامی صرف انہی برگزیدہ ہستیوں کو حاصل ہو سکتا ہے۔ جو منصب نبوت و رسالت پر فائز ہونے کی وجہ سے مہبط وحی بننے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ارشاد ہے۔

منهم من كلم الله ان پیغمبروں میں سے ہی وہ ہیں جن سے خدا نے کلام کیا۔

الغرض کسی کا کلام وہ ہے جس کے ذریعہ اس کے مافی الضمیر کا اظہار ہو، خواہ عضلات واعصاب کی راہ سے ہو یا کسی اور طریقہ سے[1]۔ اور چونکہ انبیاء کو غایت روحانی لطافت و پاکیزگی کے باعث عالم مجردات کے ساتھ بہت کچھ اتصال باطنی ہوتا ہے، اس لیے وہ صرف عالم تجرد کے حقائق کو نیز واقعات نفس الامریہ کا ہی مشاہدہ نہیں کرتے بلکہ بعض اوقات حقیقت الٰہیہ سے قریب ہو کر ارشادات ربانی کو سنتے اور ان سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ اس افادہ و استفادہ، تعلیم و تعلم اور کلام و خطاب کے لیے نہ عالم مادیات کی طرح نطق و گویائی کی ضرورت ہے اور نہ ظاہری گوش و سمع کی لیکن چونکہ عالم تجرد کی کوئی چیز ہمارے مشاہدہ میں اس وقت تک نہیں آسکتی جب تک کہ اس پر عالم ناسوت کے کسی لازمہ کا خول نہ چڑھا ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہی ارشادات ربانی جن کو خدا نے بیان فرمایا اور پیغمبروں نے سمجھا ہمارے سامنے آئیں تو انہیں الفاظ و کلمات کے جامہ میں آئیں جنہیں ہم سمجھتے ہیں۔ اور چونکہ لباس ملبوس کے تابع ہوتا ہے۔ اس لیے ملبوس کی نسبت جس چیز کی طرف ہوگی لباس بھی اسی کی طرف منسوب ہوگا۔ مثلاً ہم کرتہ پہنتے ہیں تاکہ ہمارا بدن ڈھکے۔ تو اب دیکھیے بدن کی نسبت ہماری طرف ہوتی ہے۔ تو کرتہ بھی ہماری ہی طرف منسوب ہوتا ہے یعنی ہم جس طرح "ہمارا بدن" کہتے ہیں۔ اسی طرح ہم ہمارا کرتہ بھی کہتے ہیں۔ اور ایسا کہنا بر سبیل مجاز یا بہ طور تشبیہ و استعارہ نہیں بلکہ بر سبیل حقیقت ہوتا ہے۔ اور اگر بالفرض خدا کے لیے نطق مان بھی لیا جائے اور نیاز صاحب کے قول کے مطابق انسان، نبی اور خدا کے سب کے لیے نطق پایا بھی جائے تو اس سے خدا کی صفت میں

---

[1] جاحظ المتوفی ۲۵۵ھ نے اپنی مشہور کتاب "البیان والتبیین" جلد اول باب البیان کے تحت اس موضوع پر خوب بحث کی ہے مزید تفصیل کے لیے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مماثل ہونا کس طرح لازم آتا ہے۔ قرآن مجید میں خدا نے اپنے لیے صفت سمع و بصر ثابت نہیں کی؟ تو کیا نعوذ باللہ اس کے معنی یہ ہیں کہ سب سننے اور دیکھنے والے بندے سننے اور دیکھنے کی صفت میں خدا کے مماثل ہیں؟ پھر لیس کمثلہ شی ٔ کا مطلب کیا ہوگا؟

(۵) جی ہاں؟ قرآن مجید جس سلسلہ (غالباً ترتیب) سے نازل ہوا تھا وہ موجودہ ترتیب سے مختلف ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ نیاز صاحب کے اعتراض کے بموجب اس سے قرآن مجید کا فنا ہو جانا کس طرح لازم آجاتا ہے۔ نیاز صاحب نے اپنے اعتراض کے لیے جو دلیل قائم کی ہے اس سے اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے منطق کی مشہور شکل اول یعنی العالم متغیر وکل متغیر حادث فالعالم حادث پڑھی ہے۔ لیکن انہیں اس کی خبر نہیں کہ قرآن مجید کا ترتیب خاص کے ساتھ آسمان سے نازل ہونا قرآن مجید کی ذاتیات میں داخل نہیں، بلکہ عرضیات میں ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کسی شے کی عرضیات میں سے کسی عرضی کا تغیر پذیر ہونا یا فنا ہو جانا خود اس شے کی ذات کی حدوث و قدامت پر مطلقاً اثر انداز نہیں ہوتا۔ انسان کے لیے جب تک حیوان ناطق ہونا پایا جائے گا۔ بہر حال وہ انسان رہے گا خواہ اس کے اعضاء کی ترتیب یہی رہے یا کچھ اور ہو جائے۔ ایک تخت کے پایوں کو آپ اول بدل دیجئے۔ اس کی مقدار جسمانی کو گھٹا کر بڑے سے چھوٹا کر دیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ پھر بھی تخت ہی رہے گا۔ شیخ سعدی کی گلستاں، بوستاں آج جس ترتیب سے رائج ہیں۔ اگر اس کو بدل دیا جائے اور باب اول کو باب دوم اور باب دوم کو باب اول کی جگہ رکھ دیا جائے تو کیا اس ترتیب کے بدل جانے سے گلستاں اور بوستاں کو "کلام سعدی" کہنا نادرست ہوگا؟

(۶) جی ہاں! قرآن مجید نجماً نجماً نازل ہوا ہے یعنی اس کی ہر آیت خاص وقت اور خاص حالات میں جناب رسالت مآب پر نازل ہوئی ہے جس کو اصطلاح میں شان نزول کہتے ہیں۔ اب نیاز صاحب اس پر اعتراض یہ کرتے ہیں "اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک وہ خاص وقت نہ آیا تھا، وہ آیت بھی موجود نہ تھی۔ اس لیے یہ کہنا کہ پورا قرآن لوح محفوظ میں ازل سے درج تھا۔ بے معنی ہو جاتا ہے۔" سخت حیرت ہے کہ کسی موقع و محل کے مناسب کسی آیت کے نازل ہونے سے یہ کس طرح لازم آیا کہ وہ آیت کہیں بھی موجود نہ تھی، معلوم نہیں نیاز صاحب کو اس کی خبر ہے یا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں کہ زمانہ کی تعیین محدد جہات کی حرکت سے ہوتی ہے۔ اس لیے زمان و مکان کی قید اور تفریق صرف ان چیزوں کے لیے ہی ہو سکتی ہے جو ذو جہت ہوں۔ لیکن اتنا تو وہ بھی مانتے ہوں گے کہ حضرت باری عزاسمہ قید زمان و مکان سے بلند و بالا ہے۔ اس کے لیے ماضی، حال اور مستقبل کوئی چیز نہیں۔ تمثیلاً فرض کیجئے کہ ایک شخص بہت اونچے کوٹھے پر کھڑا ہے اور اس بام کے نیچے متعدد کمروں والی ایک عمارت ہے۔ ان کمروں میں سے ہر کمرہ میں ایک ایک شخص کھڑا ہوا ہے۔ اب اس کے بعد فرض کیجئے کہ مختلف رنگین چیزوں کی ایک مسلسل قطار ہے جو اس عمارت کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ تک پھیلی ہوئی ہے، اور یہ قطار آہستہ آہستہ حرکت کر رہی ہے تو اس صورت میں دیکھیے ہر کمرہ والا صرف اسی چیز کو دیکھتا ہے جو حرکت کرتی ہوئی اس کے سامنے سے گزرتی ہے لیکن اس کے بالمقابل جو شخص اوپر برلب بام کھڑا ہوا ہے وہ بیک نظر تمام چیزوں کو دیکھ رہا ہے، اور ان میں سے ہر چیز کی نسبت اس کے دل میں ایک خیال یا رائے قائم ہے لیکن وہ سب کی نسبت اپنے خیالات کا اظہار بیک وقت نہیں کرتا۔ بلکہ کمرہ والوں میں سے جس کے سامنے جو چیز آتی ہے وہ اس وقت اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ پس قرآن مجید کا لوح محفوظ میں درج ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوٹھے پر کھڑے ہونے والے شخص کا تمام چیزوں کی نسبت اپنے دل میں ایک یا مختلف خیالات رکھنا اور پھر قرآن مجید کا نجماً نجماً نازل ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ قطار کی تدریجی حرکت کی صورت میں کسی خاص چیز کی نسبت اپنے خیال کا اس وقت ظاہر کرنا جبکہ وہ حرکت کرتے کرتے کسی ایک کمرہ والے شخص کی نظروں کے سامنے آجائے۔ معلوم نہیں ان دونوں میں کونسا استبعاد عقلی ہے۔

نیاز فتح پوری اسی سوال میں آگے چل کر لکھتے ہیں "اگر یہ کہا جائے کہ خدا کو معلوم تھا کہ فلاں وقت فلاں واقعہ پیش آئے گا اور اسی علم کی بنا پر پہلے سے ہی تمام آیات لوح محفوظ میں لکھ لی گئی تھیں تو پھر ان واقعات و حالات کے متعلق کیا کہا جائے گا جو کلام مجید میں اس انداز سے بیان کیے گئے ہیں گویا وہ قرآن کے وجود میں آنے سے پہلے ہو چکے ہیں۔" اول تو یہ سوال ہی بہت ژولیدہ ہے۔ عبارت میں "تو" کہہ کر نیاز صاحب نے جملہ متقدمہ پر جو متفرع کیا ہے تو یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں میں باہمی ربط کیا ہے۔ جس کے باعث بعد والا جملہ پہلے جملہ پر متفرع ہو سکے پھر یہ پتہ نہیں چلتا کہ "ان واقعات و حالات" سے معترض کی مراد کیا ہے؟ اگر ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے مراد واقعات ماضی یا حال ہیں تو ان کی نسبت ابھی عرض کیا جا چکا ہے۔ اور اگر ان سے مراد وہ واقعات مستقبل ہیں جن کو قرآن مجید میں بصیغہ ماضی بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً واقعات قیامت جیسے اذالشمس کورت واذا الجحیم سعرت۔ یا اتی الساعۃ۔ تو ان کی نسبت عرض یہ ہے کہ یہ اگرچہ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات ہیں لیکن چونکہ اللہ کے علم میں ان کا وقوع یقینی ہے اور اس میں ادنیٰ سا شائبہ ریب بھی نہیں اس لیے ان کو بطور جزم و تاکید بصیغہ ماضی بیان کردیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ نیاز صاحب ادیب ہونے کے باوجود زبان و بیان کے ان اسالیب بلاغت سے بھی واقف نہیں اور پھر اصل بات وہی ہے کہ ماضی، حال اور مستقبل کا فرق و امتیاز صرف ہم بلاگرفتاران مادیت کے لیے ہے، ورنہ اللہ علام الغیوب کے لیے حضرت آدم کا جنت سے نکلنا، فرعون کا دریائے نیل میں غرق ہونا، غزوۂ بدر میں مسلمانوں کا فتحیاب ہونا، اور قیامت میں چاند اور سورج اور ستاروں کا روئی کے گالوں کی طرح اڑ جانا سب برابر ہیں۔

(۷) نمبر ۷ میں جو سوال کیا گیا ہے، اس کا جواب بھی ۶ نمبر کے ذیل میں آچکا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے ازل میں ہی تمام چیزیں موجود تھیں۔ ان میں آنحضرت ﷺ کا وجود گرامی بھی تھا اور اس بنا پر قُل سے آپ کو جو خطاب کیا گیا ہے۔ وہ وقت نزولِ آیت کی طرح ازل میں بھی درست تھا۔

(۸) اگر کیا؟ واقعی قرآن مجید خدا کا کلام ہے۔ اب رہا "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کا اعتراض کہ خدا خود اپنے نام سے قرآن مجید کو شروع کرتا ہے۔ اور خود اپنی ہی ذات سے خطاب کرتا ہے۔ تو اس کے جواب میں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ قرآن مجید ہم سب لوگوں کے لیے ایک دستور و لائحہ عمل ہے جس کی روشنی میں ہم عبادات و معاملات انجام دیتے ہیں۔ اور چونکہ خدا ہمیں تلقین کر رہا ہے، اس لیے بندوں کے اسلوبِ کلام پر ہمیں تلقین کی گئی ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے بادشاہ کسی سے کہے کہ "بادشاہِ وقت تم کو ان باتوں کی ہدایت کرتا ہے۔" تو کیا اس صورت میں یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ کہنے والا بادشاہ وقت نہیں ہے؟

اس سوال کا دوسرا جزء یہ ہے "سورۂ فاتحہ میں الحمد للہ سے لے کر ملك یوم الدین تک دعا کا انداز ایسا ہے گویا مخاطب سامنے نہیں ہے۔ اور پھر دفعتاً ایاك نعبد سے انداز تخاطب بدل جاتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو حاضر مان کر خطاب کیا جارہا ہے کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ دونوں ٹکڑے علیحدہ علیحدہ دو مختلف موقعوں پر رسول اللہ کی زبان سے نکلے تھے۔" کیا خوب! نیاز صاحب جس کو انداز تخاطب کا بدل جانا کہہ رہے ہیں عربی علم معانی و بیان کی اصطلاح میں اس کو التفات کہتے ہیں۔ یہ التفات چھ قسم کا ہوتا ہے۔ تمام معانی و بیان کی کتابوں میں پوری تفصیل کے ساتھ اس کی مثالیں اور تعریفیں مذکور ہیں اور وہیں آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ التفات سے کلام کا معیار بلاغت کتنا اونچا ہو جاتا ہے، تمثیلاً آپ یوں سمجھئے کہ ایک مقرر کسی جماعت کو خطاب کرتے ہوئے پہلے سب کو متکلم کی ضمیر یعنی "ہم" سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے "ہم یوں ہی، اسی طرح پستی میں پڑے ہوئے ہیں" پھر جب سامعین اس کی طرف ہمہ تن گوش بن کر بیٹھ جاتے ہیں تو اب وہ بجائے "ہم" کے لفظ "تم" یعنی ضمیر خطاب سے لوگوں کو مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے "تم لوگ آہ کتنے بے خبر ہو!" علمائے معانی و بیان لکھتے ہیں کہ کلام میں اس طرح تنوع اور تفنن کے پیدا ہو جانے سے بہت زور پیدا ہو جاتا ہے۔ پس یہی حال سورۂ فاتحہ کا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو سورۂ فاتحہ کے ذریعہ تلقین کرتا ہے کہ وہ کس طرح اس کی حمد کریں، کس طرح اس سے مدد مانگیں، اور کیونکر اس کی بارگاہ میں دعائیں کریں۔ چونکہ مقصود تلقین و تعلیم تھا اس لیے بہتر سے بہتر انداز بلیغ کے ساتھ مسلمانوں کو تلقین کی گئی۔ اسی میں التفات سے بھی کام لیا گیا۔ مگر اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ سورۂ فاتحہ دو مختلف موقعوں پر رسول اللہ ﷺ کی زبان سے نکلی تھی۔ آہ افسوس!

سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

(۹) اعتراض نمبر ۹ کا جواب نمبر ۶ کے جواب میں آچکا ہے۔ مگر اس میں نیاز صاحب نے ایک عجیب بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں "قرآن شریف میں بکثرت ایسے واقعات اور ایسی شخصیتوں کا ذکر پایا جاتا ہے جن کا تعلق بالکل عہد نبوی سے ہے۔ مثلاً ابولہب یا کفار مکہ اور ان کے اصنام وغیرہ؟ پھر اگر قرآن مجید ازل سے یا خلق عالم کے وقت لوح محفوظ میں منقوش تھا جیسا کہ عام عقیدہ ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ سب کچھ بہ صورت مقدرات طے ہو چکا تھا اور قرآن مجید کی حیثیت ایک ایسی تاریخی کتاب کی ہو جاتی ہے جس میں واقعات کے ظہور سے پہلے صرف ان کے وقوع کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔" سبحان اللہ! ذرا اس عبارت کو بار بار پڑھیے اور غور کیجیے کہ اس کے الفاظ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں باہمی ربط اور جملوں میں منطقی ترتیب کیا ہے؟ گویا تاریخی کتابوں میں واقعات آئندہ سے متعلق پیش گوئی بھی ہوتی ہے؟ آج فن تاریخ سے متعلق یہ ایک نیا انکشاف ہوا ہے!

(۱۰) آپ کیا کہتے ہیں، یہ تو خود ہم کہہ رہے ہیں کہ جس طرح خدا کے لیے سمع و بصر ہے مگر اس کی حقیقت وہ نہیں جو ہمارے سمع و بصر کی ہے۔ اسی طرح خدا کے لیے کلام کی صفت بھی پائی جاتی ہے۔ مگر اس کے لیے وہ ہماری طرح زبان اور کان و دہن کا محتاج نہیں۔ لیکن اس کے باوجود جس طرح اس کو سمیع و بصیر کہا جاتا ہے، اسی طرح اس کو متکلم اور اس کے ارشادات کو اس کا کلام کہا جائے گا۔ عجیب ژولیدہ دماغی ہے کہ ایک طرف تو آپ خدا کی صفات کا قائل ہونے کے باوجود ان کے لیے مادی کیفیات نہیں مانتے اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ اگر قرآن کو خدا کا کلام کہا گیا تو اس سے لازم آجائے گا کہ خدا کے لیے زبان بھی مانی جائے حالانکہ لیس کمثلہ شئی۔

ان دس سوالات کے بعد نیاز صاحب لکھتے ہیں۔ "یہ ہیں چند منجملہ اور شبہات کے جنکی بنا پر میں قرآن پاک کو "منطوق خداوندی" سمجھنے سے مجبور رہوں۔" تو گزارش یہ ہے کہ اگر آپ کو قرآن پاک کے "منطوق خداوندی" سمجھنے سے مجبور ہے تو ہوا کرے۔ لیکن اب جبکہ آپ کے ان سوالات کے شافی جوابات دے دیئے گئے ہیں تو قرآن مجید کو "کلام خداوندی" تو سمجھئے اس میں اب کیا اشکال باقی رہ گیا ہے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ میں نے اپنی تحریر کو اتمام حجت کے طور پر صرف نیاز صاحب کے دس سوالات کے جواب تک محدود رکھا ہے۔ ورنہ قرآن مجید سے متعلق ان کی تحریروں کو سامنے رکھ کر گفتگو کی جائے تو بڑی آسانی سے یہ دکھایا جا سکتا ہے کہ نیاز صاحب چند سطروں میں ہی کس قدر متضاد و متناقص باتیں کہہ گئے ہیں، جن سے ان کی تشویش دماغی کے علاوہ علوم و فنون سے افسوسناک بے خبری کا پردہ چاک ہوتا ہے۔ اگر نیاز صاحب علم کلام اور فلسفہ سے واقف ہوتے تو کچھ اور نہیں کم از کم اپنی بات نبھانے کے لیے ہی قرآن مجید کے مخلوق و غیر مخلوق ہونے سے متعلق معتزلہ کے عقائد باطلہ اور ان کے کمزور دلائل کی ہی پناہ لے سکتے تھے مگر یہاں تو یہ عالم ہے:

زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا تیرا (ماخوذ: برہان اکتوبر ۱۹۶۰ء)

© rasailojaraid.com